کے نومبر / دسمبر ۲۰۰۸ء کے شمارے میں چھپ چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر اپنی تعریف کے پہلو سے نہیں، بلکہ مولانا مرحوم کے انداز نظر کی وسعت اور توازن کو واضح کرنے کے لیے اسے دوبارہ نقل کر دیا جائے۔ مولانا نے لکھا:

''برادرم مولانا محمد عمار خان ناصر صاحب زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی وقیع اور قابل قدر علمی کاوش ''حدود وتعزیرات'' کے عنوان سے وصول ہوئی۔ اس کتاب کا ہر عنوان اور ہر صفحہ گواہی دیتا ہے کہ آپ نے اخذ واستنباط، محنت اور جستجو کا حق ادا کیا ہے۔ بڑا نازک موضوع تھا جس پر آپ نے قلم اٹھایا مگر مشکل مقامات سے جس طرح آپ دامن بچا کر نکلے ہیں، اس نے صغر سنی کے باوصف علمی حلقوں میں آپ کا قد بہت اونچا کر دیا ہے۔ ''شاب شیخ'' کی ترکیب بجا طور پر آپ پر صادق آتی ہے۔ مخدوم ومحترم حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب دامت برکاتہم خوش نصیب ہیں کہ انھیں آپ جیسا ذہین وفطین اور مطالعہ کا شوقین فرزند عطا ہوا۔

یقیناً آپ کی تحقیق کے بعض نتائج سے اختلاف کیا جائے گا اور اختلاف کرنا بھی چاہیے کہ اختلاف رحمت ہے اور خوب سے خوب تر کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اختلاف، اختلاف ہی رہے، ضد اور خلاف میں تبدیل نہ ہو جائے۔ امید ہے کہ آپ بھی دلائل کی بنیاد پر کیے جانے والے اختلاف کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے اور اپنے موقف میں لچک پیدا کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ ظاہر نہیں کریں گے۔

دعا ہے کہ باری تعالیٰ شرور وفتن سے آپ کی حفاظت فرمائے اور آپ کے علم، قلم، زبان اور ذہنی صلاحیتوں سے امت مرحومہ کو بیش از بیش فائدہ پہنچے۔''

مولانا نے میری تعریف میں جو الفاظ درج کیے ہیں، ان کی اہمیت میری نظر میں ثانوی ہے اور بدیہی طور پر وہ حقیقت واقعہ سے زیادہ مولانا کے حسن ظن اور علمی قدر افزائی کے جذبے کی غمازی کرتے ہیں، لیکن اس سے علمی وتحقیقی مباحث کے ضمن میں ان کا جو زاویہ نظر سامنے آتا ہے، وہ ان کے طبقے کے علما میں یقینی طور پر ایک جنس نایاب ہے۔

مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ کا قتل اس سلسلہ کشت وخوں کی ایک تازہ کڑی ہے جو ہمارے ہاں مذہب، نسل اور قومیت کے نام پر ایک طویل عرصے سے جاری ہے۔ کراچی میں یہ تمام عوامل یکجا ہیں، اس لیے یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ مولانا کے قاتلوں کے نزدیک ان کا جرم سنی ہونا تھا یا دیوبندی یا پنجابی یا اعتدال پسند یا کچھ اور۔ پس منظر جو بھی ہو، نتیجہ بہر حال ایک ہی ہے کہ معاشرہ ایک جید، صاحب کردار، متوازن خیالات ورجحانات کے حامل اور نہایت موثر اور مثبت انداز میں دین کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے والے ایک عالم دین سے محروم ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہ۔

مختلف کلامی تعبیرات کی حقیقت اور ان سے استفادہ کی گنجائش

ابو عثمان عمرو بن بحر بن محبوب الجاحظ (۱۶۳--۲۵۵ھ) دوسری / تیسری صدی ہجری کا ایک باکمال ادیب اور متکلم ہے۔ اس کا شمار معتزلہ کے ائمہ اور کبار میں ہوتا ہے، تاہم اس کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف نصوص کی

اتباع اور عقل وقیاس کی رعایت کے مابین توازن کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے، بلکہ مختلف ذہنی وفکری سطحوں کی دینی ضروریات کے لحاظ سے اپنے اپنے دائرے میں معتزلہ اور متکلمین کے الگ الگ مناہج کی افادیت کا بھی معترف ہے، چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ: لولا مکان المتکلمین لهلکت العوام من جمیع الامم ولولا مکان المعتزلة لهلکت العوام من جمیع النحل (کتاب الحیوان، ص۵۲۷ وص۹۳۷، طبع دار الکتاب العربی بیروت، ۲۰۰۸ء)۔ ''اگر متکلمین نہ ہوتے تو تمام امتوں (یعنی مذاہب) سے تعلق رکھنے والے عوام (یعنی ان کا عقیدۂ وایمان) برباد ہو جاتا اور اگر معتزلہ نہ ہوتے تو (دائرۂ اسلام میں داخل) تمام مذہبی گروہ (یعنی ان کا عقیدۂ وایمان) تباہ ہو جاتا۔'' جاحظ کی مراد یہ ہے کہ متکلمین کے ہاں نصوص سے قریب تر رہنے کے جس منہج کو ترجیح دی گئی ہے، اس میں عوام الناس کی ذہنی سطح کی زیادہ رعایت پائی جاتی ہے اور انھیں دین وایمان سے وابستہ رکھنے کے لیے یہی طریقہ مفید اور موثر ہے، لیکن ایک مختلف ذہنی سطح پر دینی حقائق پر غور وفکر سے مسلمانوں کے جو کلامی فرقے وجود میں آئے ہیں، ان کی تشفی متکلمین کے طریقے سے نہیں ہو سکتی اور ان کے لیے معتزلہ کا طریقہ ہی راہ نجات کا درجہ رکھتا ہے۔

کلامی نوعیت کے بیشتر اختلافات اور نزاعات کی اصل حقیقت یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم دینی وعلمی مصالح کے تناظر میں بوقت ضرورت ایسی تعبیرات سے بھی استفادہ کرتے رہے ہیں جنھیں عام طور پر 'اہل السنۃ' کے منہج سے ہٹا ہوا قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کے 'معجز' ہونے کا مطلب اہل سنت کے متکلمین کے نزدیک یہ ہے کہ یہ کلام اپنے اندر داخلی طور پر ایسے کمالات واوصاف رکھتا ہے کہ اس کی نظیر پیش کرنا کسی فرد بشر کے بس میں نہیں۔ اس کے برعکس معتزلہ کا مسلک یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن کے اعجاز کا تعلق داخلی اوصاف سے نہیں، بلکہ اس بات سے ہے کہ اگر کوئی انسان اس کی مثل کلام بنانے کی کوشش کرتا ہے تو فی نفسہ ممکن ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اسے ایسا کرنے سے عاجز کر دیتے ہیں۔ امام رازی نے قرآن کی مختصر سورتوں میں اعجاز کا پہلو واضح کرتے ہوئے اسی تعبیر کی مدد لی ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> وهذه الطريقة وان لم تكن مرضية لان القرآن فی نفسه معجز لا يستطيع البشر معارضته كما قررنا الا انها تصلح على سبيل التنزل والمجادلة والمنافحة عن الحق (تفسیر ابن کثیر، البقرہ، آیت ۲۳، ۲۴)
>
> ''اگرچہ یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ قرآن فی نفسہ معجز ہے اور انسانوں کے لیے اس کی نظیر پیش کرنا ممکن نہیں، تاہم بر سبیل تنزل اور حق کا دفاع کرتے ہوئے اس طریقہ استدلال کو اختیار کرنا درست ہے۔'' اسی طرح مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے دروس ترمذی میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ صفات باری تعالیٰ کے بارے میں سلف کا مسلک امرار علی الظاہر اور عدم تاویل تھا (بلکہ ایک خاص دور میں اسے راہ راست اور گمراہی کے مابین امتیاز کی حیثیت حاصل رہی ہے)، تاہم متاخرین نے تاویل کے طریقے کو عوام کی ذہنی سطح کے زیادہ قریب پاتے ہوئے مصلحت کی خاطر اسی مسلک کو اختیار کر لیا۔

مختلف ذہنی سطحوں اور ہر زمانہ کے خاص ذہنی معیارات کے لحاظ سے دینی حقائق ومسائل میں تعبیرات کا یہ تنوع اور